دبستان دہلی کے شعرا اور ان کی شاعرانہ خصوصیات

داؤد اختر

گورنمنٹ ڈگری کالج پبی نوشہرہ

دبستان کی تعریف:

جب بہت سے ادیب اور شعرا حضرات ایک مخصوص علاقے اور زمانے کی طرز، بود و باش اور سماجی اقدار سے متاثر ہو کر ادب میں ایک ہی طرز فکر اور انداز نظر اپناتے ہیں تو اسے دبستان کہا جاتا ہے۔ جیسے دبستان لکھنو، دبستان دہلی، دبستان عظیم آباد وغیرہ۔

دبستان دہلی:

دبستان دہلی اردو ادب کا اولین اور مخصوص دبستان ہے جو دہلی شہر اور خصوصاً قلعہ معلی کی زبان و ادب کا نمائندہ سمجھا جاتا ہے۔ اورنگزیب کی وفات کے بعد اُس کا بیٹا معظم تخت نشین ہوا لیکن اس کے بعد معظم کے بیٹے معزالدین نے اپنے بھائی کو شکست دے کر حکومت بنائی۔ معزالدین کے بھتیجے "فرخ سیر" نے سید برادران کی مدد سے حکومت حاصل کی لیکن سید برادران نے فرخ سیر کو بھی ٹھکانے لگا دیا۔ اس طرح 1707ء سے لے کر 1719ء تک دہلی کی تخت پر کئی بادشاہ تبدیل ہوئے۔ محمد شاہ رنگیلا کی عیاشی کے دور میں نادر شاہ درانی نے دہلی پر حملہ کر دیا اور دہلی کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ پھر احمد شاہ ابدالی کے حملے نے مزید کسر بھی پوری کر دی۔ دوسری طرف مرہٹے، جاٹ اور روہیلے آئے دن دہلی پر حملہ آور ہوتے اور قتل عام کرتے اس دور میں کئی بادشاہ بدلے اور مغل سلطنت محدود ہوتے ہوتے صرف دہلی تک محدود ہو کر رہ گئی۔ اور آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کو انگریزوں نے معزول کر کے رنگوں بھیج دیا۔ یہ تھی دہلی کی مختصر تاریخ جس میں دبستان دہلی کا ادب پروان چڑھا۔ یہ ایک ایسا پر آشوب دور تھا جس میں ہر طرف بد نظمی، انتشار اور پستی کا دور دورہ تھا۔ ملک میں ہر طرف بے چینی تھی۔ اس حالت کی وجہ سے جس قسم کی شاعری پروان چڑھی۔ دبستان دہلی کے چند شعرا کا ذکر درج ذیل ہے۔

اہم شعرا:

میر تقی میر 1723ء

آگرہ میں پیدا ہوئے اور 1810ء لکھنؤ میں انتقال کیا۔ اردو شاعری کے خدائے سخن کہلاتے ہیں۔ پروفیسر مجنوں گورکھپوری نے کہا کہ: اردو شاعری بھی اگر اپنا خدا رکھتی تو وہ میر تقی میر ہوتے۔ میر تقی میر کی شاعری کا اہم بنیادی عنصر غم سب سے نمایاں ہے۔ خود میر نے اپنی شاعری کے بارے میں کہا ہے:

مجھ کو شاعر نہ کہو میر کے صاحب میں نے
درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا
ابتدا ہی میں مر گئے سب یار
عشق کی کون انتہا لایا

پتا پتا بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے
اب تو جاتے ہیں مے کدے سے میر
پھر ملیں گے، اگر خدا لایا

مرزا محمد رفیع سودا

سودا، میر کے ہمعصر تھے۔ ان کا شمار اردو زبان کے اہم شعراء میں ہوتا ہے۔ انھوں غزل، قصیدہ، مثنوی، مخمس، ہجو، رعبایاں، قطعے، ترجیع بند، واسوخت، سلام، مرثیے غرض کہ ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی۔ لیکن ان کی شہرت بحیثیت قصیدہ گو اور ہجو گو کے زیادہ ہے۔ ان کی غزلوں کی تعداد نسبتاً کم ہے لیکن غزل میں ان کے مقام اور مرتبہ سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ بقول خلیق انجم:

''سودا کے ہاں زورِ بیان، معنی آفرینی، خیال بندی، پرواز تخیل، جدت بیان، قدرتِ اظہار، نشاط انگیزی اور جو جوش و خروش ملتا ہے وہ انہی کا حصہ ہے۔''
لیکن یہ بات یادرہے کہ سودا کی غزلوں میں خلوص اور جذبات کی سادگی، بے ساختگی اور درد و سوز بھی ہے۔ جو میر کی غزل کا طرہ امتیاز ہے۔

جس روز کسی اور پہ بیداد کرو گے
یہ یاد رہے ہم کو بہت یاد کرو گے

کیفیت چشم اس کی مجھے یاد ہے سودا
ساغر کو میرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

سودا جو تیرا حال ہے اتنا تو نہیں وہ
کیا جانیے تو اسے کس حال میں دیکھا

خواجہ میر درد:

میر درد ایک مشہور خاندان کے چشم و چراغ تھے اور ایک صوفی باپ کے بیٹے تھے۔ انھوں نے تصوف کو صرف روایت سے مجبور ہو کر نہیں اپنایا بلکہ وہ خود ایک با عمل صوفی تھے۔ ان کے مزاج میں اعتدال، توازن، حلم، تحمل اور بردباری کی صفات موجود تھیں۔ اس لیے جہاں جاتے عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ قناعت اور خودداری ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ان کی انہی صفات کا عکس ان کی شاعری میں بھی نظر آتا ہے۔ بقول عظمت اللہ:
''خواجہ میر درد اردو ادبیات میں صوفیانہ شاعری کے باوا آدم تھے''

جگ میں آکر ادھر ادھر دیکھا
تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا

ارض و سما کہاں تیری وسعت کو پا سکے
میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما سکے

اس ہستی خراب سے کیا کام تھا ہمیں
اے نشہ ظہور یہ تری ترنگ تھی

ابراہیم ذوق:

ذوق کو بعض نقادوں نے سودا کے مشابہ قرار دیا ہے ایک تو اس لیے ہجو گوئی کے باوجود دونوں کا کوئی مخصوص طرز احساس نہیں اور دوسرے قصیدہ کو بھی پایہ کمال تک پہنچایا۔ ان کی غزل میں جذبے کا فقدان نظر آتا ہے اس لیے کہ انھوں نے محض الفاظ کے ذریعے شاعری کی۔ انھوں نے فکر اور جذبہ کی کمی کو محاورات کے ذریعے پوری کرنے کی کوشش کی۔ بعض اشعار دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ صرف محاورہ بندی کے لیے لکھے گئے ہیں۔ ان کی شاعری میں حسن و عشق کی واردات بھی ہیں اور تصوف اور اخلاقی پند بھی لیکن یہ سب روایتی محسوس ہوتے ہیں۔

وقت پیری شباب کی باتیں
ایسی ہیں جیسے خواب کی باتیں

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی سے آئے نہ اپنی خوشی چلے

مرزا اسد اللہ خان غالب:

غالب کی شاعری ہر دور میں نہ صرف زندہ رہی بلکہ جدید بھی رہی۔ان کے ہاں ہمیں جنس کا ایک صحت مندانہ رویہ ملتا ہے۔انھیں مسلسل پریشانیوں اور محرومیوں نے نہ صرف زندگی سے پیار کرنا سکھایا۔انھوں نے غم کو ایک حقیقت کے روپ میں قبول کیا۔ان کے نزدیک غم کے وجود کو تسلیم کر لینے کے بعد اس کی تلخی اور چبھن میں کافی کمی ہو جاتی ہے۔

نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانیے
بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن

غالب کی شاعری اس کے فلسفیانہ اور جدید ذہن کی غمازی کرتا ہے۔جو نئی تہذیب اور پرانی تہذیب کی آویزش اور کشمکش سے وجود میں آئی ہے۔

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

ہیں آج کیوں زلیل کہ کل تک نہ پسند
گستاخی فرشتہ ہماری جناب میں

مومن خان مومن:

مومن تمام عمر غزل کے پابند رہے اور غزل میں کم سے کم الفاظ میں بڑے سے بڑے خیال ابلاغ اور شدید سے شدید جذبہ کی عکاسی کی کوشش کی۔اسی لیے جذبہ عشق سے وابستہ تہ در تہ کیفیات کے اظہار میں کمال پیدا کیا۔چنانچہ انھوں نے دہلی کی خالص اردو میں صاف ستھری غزل تخلیق کی۔لکھنوی شعراء کے برعکس انھوں نے جنس نگاری کو فحش اور ابتذال سے بچا کر صحت مند حدود میں رہنے دیا۔ان کی معاملہ بندی لکھنوی شعراء سے یکسر مختلف نظر آتی ہے۔ان کے ہاں ایک جدید تصور عشق ملتا ہے۔مومن کا عاشق واضح طور پر ہر جائی ہے۔

ہم بھی کچھ خوش نہیں وفا کر کے
تم نے اچھا کیا نباہ نہ کی

نقادوں نے ان کی شاعری کی اہم خصوصیت نکتہ آفرینی کو بھی قرار دیا ہے۔

تا نہ خلل پڑے کہیں آپ کے خواب ناز میں
ہم نہیں چاہتے کمی اپنی شب دراز میں

عمر تو ساری کٹی عشقِ بتاں میں مومن
آخری عمر میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

دبستان دہلی کی شاعرانہ خصوصیات:

فارسی آمیز زبان:

دبستان دہلی کے شعرا کے ہاں فارسیت کا بہت غلبہ تھا کیونکہ شعرائے دہلی فارسی کی شعری روایت سے متاثر تھے اور ان پر فارسی شعراء کا گہرا اثر تھا۔ایران سے جو شعراء آتے تھے ان میں سے اکثر یہاں ہی رہ جاتے تھے۔چنانچہ، خسرو، حسن، عرفی، نظیری، طالب، صائب اور بیدل وغیرہ مختلف ادوار میں یہاں رہے۔اس کے علاوہ یہاں فارسی شعراء کی زبان تھی۔نیز یہاں کے شعراء اردو اور فارسی زبانوں میں دسترس رکھتے تھے۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فارسی اسالیب و موضوعات وغیرہ دہلی کے دبستان شاعری میں شامل ہو گئے۔اس طرح بہت سے شعرا نے فارسی شعراء سعدی، و حافظ کا ترجمہ کیا۔اور خزانہ اردو کو مالا مال کیا۔اس طرح دبستان دہلی کی شاعری میں فارسیت کا غلبہ ہے۔

تصور عشق:

دبستان دہلی کے شعراء کے ہاں جذبات واحساسات کے اظہار پر زیادہ زور رہے۔ دبستان دہلی کے شعراء نے عشق کے جذبے کو اولیت دی۔ بقول ڈاکٹر نور الحسن شعرائے دہلی کو اس بات کی پروا نہیں تھی کہ ان کا اسلوب بیان اور طرز ادا خوب تر ہو بلکہ ان کی کوشش تھی کہ شاعری میں جذبات واحساس کا اظہار ہو جائے۔ اس لیے بعض اوقات تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ گویا شاعر کو عشق سے عشق ہو گیا ہے۔ دہلی کے کچھ شعراء عشق مجازی سے گذر کر عشق حقیقی سے سرشار ہوئے۔ ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ سے لو لگائی اور فیضان عشق کی بدولت ان میں ایسی بصیرت پیدا ہوئی کہ وہ تمام بنی نوع انسان سے محبت کرنے لگے۔ جبکہ کچھ لوگ عشق مجازی کی منزل پر رک گئے۔ چنانچہ ان کی شاعری میں محبت کا سوز اور تڑپ موجود ہے۔ جبکہ کچھ لوگ نفس پر قابو نہ پاسکے اور وہ ابولہوسی میں مبتلا ہو کر رہ گئے۔ چنانچہ دہلی میں عشق کے یہ تینوں مدارج موجود ہیں۔ مثلاً درد جیسے شاعروں نے صوفی شاعری کی اور عشق حقیقی کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔

قاصد نہیں یہ کام ترا اپنی راہ لے
اس کا پیام دل کے سوا کون لا سکے

جب وہ جمال دلفروز صورت مہر نیم روز
آپ ہی ہو نظارہ سوز پردے میں منہ چھپائے کیوں

عشق مجازی:

عشق کا دوسرا انداز جو دہلی میں بہت مقبول ہوا اس میں عشق حقیقی کے ساتھ ساتھ عشق مجازی کے جذبات بھی شامل ہو گئے۔ یہ رنگ میر تقی میر نے بہت خوبی سے نبھایا۔ ان کے جذبہ عشق میں وہ خلوص اور گہرائی تھی جس نے ان کی شاعری کو حیات جاوداں عطا کی۔ عشق کا یہ تیکھا انداز دبستان دہلی سے مخصوص ہے۔ عشق مجازی کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔ جن میں دہلی کے تمام شعراء نے بڑی خوبصورتی سے ان جذبات کو شاعری کا روپ دیا ہے۔

پاس ناموس عشق تھا ورنہ
کتنے آنسو پلک تک آئے تھے

جس روز کسی اور پہ بیداد کرو گے
یہ یاد رہے ہم کو بہت یاد کرو گے

لوگ کہتے ہیں عاشقی جس کو
میں جو دیکھا بڑی مصیبت ہے

پھر کے جو وہ شوخ نظر کر گیا
تیرے کچھ دل میں گذر کر گیا

حزن ویاس:

دبستان دہلی کی شاعری کی ایک اور نمایاں خصوصیت رنج والم اور حزن ویاس کا بیان ہے۔ دبستان دہلی کی شاعری کا اگر بحیثیت مجموعی جائزہ لیا جائے تو احساس ہوتا ہے کہ دبستان دہلی کی شاعری میں یاس وناامیدی کے جذبات بکثرت موجود ہیں۔ شاعر خواہ کسی موضوع پر بات کرے رنج والم کا ذکر ضرور آجاتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اس سارے دور میں کسی کو اطمینان وسکون نصیب نہ تھا۔ زندگی ایک خواب پریشاں بن کر رہ گئی تھی۔ ہر طرف نفسا نفسی کا عالم تھا۔ کسی شے کو ثبات نہ تھا۔ ان حالات کا شاعری پر بھی گہرا عکس نظر آتا ہے۔ خارج میں تباہی وبربادی پھیلی ہوئی تھی اور تباہی وبربادی کے تاریک سائے شاعری میں بھی راہ پاتے ہیں۔ چنانچہ فنا کا احساس بہت تیز ہے۔ اس کے ساتھ اجڑے ہوئے شہر، لٹے ہوئے نگر اور ویران گذرگاہیں جابجا موجود ہیں۔ خصوصاً میر وسودا کے دور میں زندگی کی ناپائیداری کا احساس بہت شدت سے اظہار کی راہ پاتا ہے۔ چنانچہ حزن ویاس کے چند شعر ملاحظہ ہوں:

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات
کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

دل گنوانا تھا اس طرح قائم
کیا کیا تو نے ہائے خانہ خراب

دل کی ویرانی کا کیا مذکور
یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید
ناامیدی اس کی دیکھا چاہیے

اس گلشن ہستی میں عجب دید ہے لیکن
جب آنکھ گل کی کھلی تو موسم تھا خزاں کا

اس حزن و یاس کی فضاء کے بارے میں نیاز فتح پوری لکھتے ہیں کہ ” ظاہر ہے دہلی کی شاعری یک سر جذبات کی زبان و گفتگو ہے اور جذبات بھی وہی ہیں جن کا تعلق زیادہ تر حرماں و مہجوری وناکامی سے ہے۔“

تصوف: واردات قلبی کے اظہار کے بعد دبستان دہلی کے شعراء کا دوسرا محبوب ترین موضوع تصوف ہے۔ چونکہ ابتداء میں اردو شاعری پر فارسی شاعری کی شعری روایت کا بہت زیادہ غلبہ رہا ہے جس کی وجہ سے اردو شعراء نے غیر شعوری طور پر فارسی شاعری کے اسالیب، سانچے اور موضوعات قبول کر لیے۔ دوسری طرف اس موضوع کو اس لیے بھی مقبولیت ملی کہ کہ تصوف میں بھی قناعت، صبر و توکل اور نفی ذات کے نظریات نے زیادہ زور پکڑا کیونکہ اس زمانے کے حالات ہی ایسے تھے جن کی بناء پر لوگ ترک دنیا کی طرف مائل ہو رہتے تھے۔ اس زمانے میں یہ خیال عام تھا کہ تصوف برائے شعر گفتن خوب است
ان میں کچھ تو صوفی شعراء تھے لیکن زیادہ تر شعراء نے محض رسمی طور پر تصوف کے مضامین کو نظم کیا۔ چنانچہ ذوق اور غالب کے زمانے تک تقریباً ہر شاعر کے کلام میں تصوف کے مضامین نظر آتے ہیں۔ تصوف کی مقبولیت کا دوسرا سبب یہ تصورات و اقدار تھے جو ہندوستان کی فضاء میں رچے بسے ہوئے تھے۔ جن کی بدولت انھوں نے تصوف کو موضوع بنایا۔

مسافر اٹھ تجھے چلنا ہے جانب منزل
بجے ہیں کوچ کا ہر دم نقارہ شاہ حاتم

سر سری تم جہاں سے گذرے
ورنہ ہر جا جہان دیگر تھا

غافل قدم کو اپنے رکھیو سنبھال کر یاں
ہر سنگ راہ گذر کا دکاں شیشہ گر کا ہے

اس قدر سادہ و پر کار کہیں دیکھا ہے
بے خود اتنا نمودار کہیں دیکھا ہے

ہے جلوہ گاہ تیرا، کیا غیب کیا شہادت
یاں بھی شہود تیرا، واں بھی شہود تیرا

اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا
جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا

اس ہستی خراب سے کیا کام تھا ہمیں
اے نشہ ظہور یہ تیری ترنگ تھی

راز پوشیدہ پوچھے کس سے
بے خبر ہے، جو باخبر ہے

رمزیت اور اشاریت:

تصوف کی بدولت اردو شاعری میں بڑی وسعت پیدا ہوئی چنانچہ بقول ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی، ” دہلی میں تصوف کی تعلیم اور درویشی کی روایت نے خیالات میں بلندی اور گہرائی پیدا کی اور اسلوب میں متانت و سنجیدگی کو برقرار رکھا۔ تصوف کے روایات نے شاعری کو ایک اخلاقی لب ولہجہ دیا اور ابتذال سے دور رکھا۔“
مسائل تصوف نے اردو غزل کو رمز و کنایہ کی زبان دی، پیر مغاں، گل، بلبل، چمن، شمع، پروانہ، میکدہ، اسی طرح کی اور بہت سی علامتیں تصوف کے راستے اردو شاعری میں

داخل ہوئیں۔ تصوف نے اردو شاعری کو فکری پہلو بھی دیا اور استغنا کا درس دے کر درباداری سے الگ رکھا۔ مزاجوں میں خودداری اور بے نیازی پیدا کی۔ تصوف کی بدولت اردو شاعری میں جو رمزیت اور اشاریت آئی اس سے شعراء نے بہت فائدہ اٹھایا اور چند لفظوں میں معنی کی دنیائیں آباد کیں۔ ذیل کے اشعار دیکھیے کہ پردوں میں کتنے جہاں آباد دکھائی دیتے ہیں۔

ساقی ہے اک تبسم گل، فرصت بہار
ظالم بھرے ہے جام تو جلدی سے بھر کہیں

دام ہر موج میں ہے حلقہ صد کام نہنگ
دیکھیں کیا گذرے ہے قطرے کو گہر ہونے تک

وہ بادہ وشبانہ کی سرمستیاں کہاں
اٹھیے بس اب کہ لذت خواب سحر گئی

داخلیت:

دبستان دہلی کی شاعری کا ایک اور نمایاں پہلو داخلیت ہے۔ داخلیت سے مراد یہ ہے کہ شاعر باہر کی دنیا سے غرض نہیں رکھتا بلکہ وہ اپنے دل کی واردات کا اظہار کرتا ہے۔ اگر باہر کی دنیا کے متعلق کچھ کہتا ہے تو اُسے بھی شدید داخلیت میں ڈبو کر پیش کرتا ہے۔ یہ داخلیت دہلی کے ہر شاعر کے یہاں ملتی ہے۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لیں کہ شعرائے دہلی کے ہاں خارجیت بالکل نہیں ہے۔ خارجیت بھی ہے۔ لیکن داخلیت میں واردات قلبی یعنی عشق و محبت کے مضامین اور ان مصائب کا بیان شعرائے دہلی نے نہایت خوش اسلوبی سے کیا ہے۔

پاس ناموس عشق تھا ورنہ
کتنے آنسو پلک تک آئے تھے

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزہ پایا
درد کی دوا پائی درد لا دوا پایا

سادگی:

شعرائے دہلی کے ہاں زبان میں بھی سادگی، صفائی اور شستگی پائی جاتی ہے۔ شعرائے دہلی نے جس طرح مضامین میں واقعیت و صداقت کو مد نظر رکھا ہے۔ اسی طرح زبان بھی سادہ اور عام فہم استعمال کی ہے۔ اگرچہ ان شعراء نے صنعتوں کا استعمال کیا ہے لیکن وہ صنعت برائے صنعت کے لیے نہیں ہے۔ اس کی بجائے ان شعراء نے معنوی حسن کی طرف زیادہ توجہ دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں تشبیہ اور استعارے کا استعمال حد سے آگے نہیں بڑھتا۔

میر اُن نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

دل بھی تیرے ہی ڈھنگ سیکھا ہے
آن میں کچھ ہے آن میں کچھ

اختصار:

شعرائے دہلی کے کلام میں جہاں زبان میں سلاست و روانی کا عنصر نمایاں ہے وہاں اختصار بھی ہے۔اس دور میں دوسری اصناف کے مقابلے میں غزل سب سے زیادہ نمایاں رہی ہے۔اور غزل کی شاعری اختصار کی متقاضی ہوتی ہے۔اس میں نظم کی طرح تفصیل نہیں ہوتی بلکہ بات اشاروں کنایوں میں کی جاتی ہے۔اس لیے ان شعراء کے ہاں اختصار ملتا ہے۔نیز غزل کا مخصوص ایمائی رنگ بھی موجود ہے۔یہاں کے شعراء اپنے دلی جذبات واحساسات کو جوں کا توں بڑی فنکاری سے پردے ہی پردے میں پیش کر دیتے ہیں۔اسی بات کا ذکر کرتے ہوئے محمد حسن آزاد لکھتے ہیں کہ :ان بزرگوں کے کلام میں تکلف نہیں جو کچھ سامنے آنکھوں کے دیکھتے ہیں اور اس سے خیالات دل پر گزرتے ہیں وہی زبان سے کہہ دیتے ہیں۔اس واسطے اشعار صاف اور بے تکلف ہیں۔''

ہم نشیں ذکر یار کر کچھ آج
اس حکایت سے جی بہلتا ہے

بے وفائی پہ اس کی دل مت جا
ایسی باتیں ہزار ہوتی ہیں

شائد اسی کا نام محبت ہے شیفتہ
اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی

تو کہاں جائے گی کچھ اپنا ٹھکانا کر لے
ہم تو کل خوابِ عدم میں شب ہجراں ہوں گے

دل مجھے اس گلی میں لے جا کر
اور بھی خاک میں ملالایا

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے
بے نیازی تیری عادت ہی سہی

مجموعی جائزہ:

دبستان دہلی کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی لکھے ہیں کہ

"دہلویت ایک خاص افتادذہنی یا مزاج شعری کا نام نہیں ہے جس کا اظہار مخصوص تمدن و شہری اثرات کی وجہ سے ہوا۔دہلی کا شاعر غمِ روزگار کا ستایا ہوا غم عشق کا مارا ہوا ہے۔اسی لیے اس کے کلام میں دونوں کی کسک اور کھٹک پائی جاتی ہے۔سیاسی حالات نے اسے قنوطی بنایا، تصوف نے اس میں روحانیت پیدا کی اور اس کے ساتھ ساتھ ایک اخلاقی نصب العین اور تصور عطا کیا۔اسی نے اس کی آنکھیں اندر کی طرف کھولیں۔(نورالحسن ہاشمی، دلی کا دبستان شاعری، ص:13)